اُردو کے فروغ میں مسلمانوں کا کردار

زبان انسان کے لیے اللہ تعالیٰ کا ایک تحفۂ بے بدل ہے جس کا اوتار کوئی شے نہیں ہو سکتی۔ انسانی زندگی میں اس کا کردار واضح اور بیّن ہے۔ زبان نے انسان کو معرفتِ خداوند کریم سے آشنا کیا ہے۔ زبان کی کوکھ سے شعر و ادب، فلسفہ، سائنس کی ایجادات اور باہمی تعارف و پہچان نے جنم لیا۔ انداز زیست اور تعلقات باہمی کا سبق ہمیں زبان نے دیا ہے۔ اس لیے یہ کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ انسان حیوانِ ناطق ہے۔ بالکل اس حقیقت سے انحراف نہیں کیا جا سکتا کہ انسان کی بقا کا سبب زبان میں مخفی ہے۔

زبان انسانوں سے زندہ ہے اور انسان زبان سے زندہ ہیں۔ اگر ان کا آپس کا تعلق ختم ہو جائے تو دونوں کا نتیجہ بات ہے۔ ذکر الٰہی جو اطمینان قلب و نظر ہے وہ بھی زبان کے ذریعہ ہی ممکن ہے۔ انسان اور زبان کا آپس میں رشتہ کیسے بنا، انسان اور زبان کس طرح ایک دوسرے سے آشنا ہوئے۔ کیا انسانی زبان کا ماخذ ایک ہے۔ جب اصل ایک مان لی جائے تو زبانوں کا تنوع کیسے وقوع پذیر ہوا۔ ان میں اجنبیت اور تفاوت کا سبب کیا ہے؟ زبانوں کے خاندان اور ان کی پہچان کہ کوئی زبان کس خاندان کی پروردہ ہے۔ بولیاں، ٹھولیاں اور لہجے کیونکر وجود میں آئے۔ لہجے اور بولی کی ضرورت زبان کے ہوتے ہوئے کیوں در آئی۔

زبان کی ترقی قوموں کی ترقی کا سبب ہے۔ زبان ایک ایسا آلہ ہے جس کے ذریعے ہم نہاں خانۂ دل کے لطیف اور خفیف جذبات کا اظہار کرنے پر قادر ہوتے ہیں۔ اگر زبان کا ذخیرۂ الفاظ وسیع تر ہو گا تو اس زبان میں جذبات کا ابلاغ آسان ہو گا۔ زبان کے دامن کی الفاظ کو پناہ ملتی ہے اور اس طرح دوسری زبانوں کے الفاظ اس کے اندر وسعت پذیری کا سبب بنتے ہیں۔ جس سے اس کا دامن افہام و تفہیم میں وسعت پذیر اور ہمہ گیر ہوتا ہے اور اس زبان میں علم و ادب کا سرمایہ فروغ گیر اور نمو پذیر ہوتا ہے اور اس ادبائے ادب کو تخمِ علم و ادب اور نخلِ ادب کے پروان چڑھانے کے وقیع مواقع ملتے ہیں۔

معاشرے کا زبان پر اور زبان کا معاشرے پر کیا اثر پڑتا ہے؟ معاشرے میں مختلف طبقات کی زبانوں میں فرق کی نوعیت کیا ہے؟ انسانی زبان اور فکرِ انسان میں کیا قدرِ مشترک ہے۔

مولانا آزاد لکھتے ہیں:

زبان کا استقلال اور آئندہ کی زندگی چار ستونوں کے استقلال پر منحصر ہے۔ قوم کا ملکی استقلال، سلطنت کا اقبال، اس کا مذہب اور تعلیم و تہذیب اگر یہ چاروں پاسبان پورے زوروں سے قائم ہیں تو زبان بھی زور پکڑتی جائے گی۔ ایک یا زیادہ جتنے کمزور ہوں گے اتنی ہی

زبان ضعیف ہوتی جائے گی۔ یہاں تک کہ مر جائے گی۔ ہر زبان وسیع تر دامن کی متحمل ہوتی ہے جس میں متعلقہ قوم کی تہذیب و تمدن اور تاریخ و روایات اور رہن سہن کے طور طریقے اور سماجیات کا وسیع ذخیرہ پوشیدہ ہوتا ہے۔ ہر خطے کی زبان اس کا تشخص اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ قومی زبان اور تشخص میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ زیر نظر مضمون میں اردو کے فروغ میں مشاہیر ادب کا کارہائے نمایاں کی نسبت جائزہ لیا جائے گا۔ اس تحریر سے میری یہ ہر گز مراد نہیں ہے کہ اردو کے فروغ و اشاعت میں صرف اور صرف مسلمانوں نے ہی کام کیا ہے اور دوسری قوموں نے اس سلسلے میں کچھ نہیں کیا۔ رتن ناتھ سرشار، مالک رام، نول کشور، منشی پریم چند، ہری چند اختر، تلوک چند محروم، پنڈت دیا شنکر نسیم، سری رام، چکبست کرشن چندر، رام بابو سکسینہ، منشی تیرتھ رام فیروز پوری، دیوان سنگھ مفتون، فراق گورکھپوری، گیان چند، آنند نرائن ملّا، راجندر سنگھ بیدی، پروفیسر جگن ناتھ آزاد، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، مسز سروجنی نائیڈو جیسے اہل قلم کی اردو زبان و ادب کے بارے میں خدمات سے بھلا کون انکار کر سکتا ہے؟ لیکن سچی اور پکی بات ہے کہ مسلمانوں نے اس ضمن میں سب سے بڑھ چڑھ کر کردار ادا کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ دوسری قوموں نے اس زبان کو من حیث القوم نہیں اپنایا کیوں کہ ان کے پاس وسیلۂ اظہار کے لیے دوسری دیسی زبانیں بھی موجود تھیں جنھیں انھوں نے بوقت ضرورت استعمال بھی کیا ہے لیکن مسلمانوں نے من حیث القوم ہندوستان کی سینکڑوں زبانوں میں سے صرف اسی ایک زبان پر قناعت کی اور اپنے خیالات کے اظہار کا واحد بھرپور اور مؤثر وسیلہ بنایا۔

اسلام ایک طریق حیات ہے اور انسانی زندگی کے تمام پہلوئوں کو محیط ہے۔ عربی زبان اسلامی احکامات کی امین ہے۔ اس میں زندگی کے تمام شعبوں کے لیے کلمات و مفردات کا ایک بحرِ زخار موجود ہے جس نسبت سے یہ کلمات برصغیر کی مقامی زبانوں میں داخل ہوتے گئے، اسی نسبت سے ان کا عربی زبان سے قرب بڑھتا گیا۔ یہ اُن مشاہیر ادب کی محنت کا پھل ہے کہ برصغیر پاک و ہند کے عوام اپنے دین سے محبت کرنے والے ہیں اور تہذیبی و تمدنی اقدار کے حوالے سے اپنے عرب بھائیوں سے بہت قریب ہیں۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں:

"اردو ہماری گزشتہ عروجِ عظمت کی تنہا یادگار یا سوگ وار ہے۔ مسلمانوں نے نہ صرف اردو کی بنیاد رکھی بلکہ اس کی تمام تدریجی اور ارتقائی منازل میں انہی کا ذہن و دماغ کارفرما ہے۔ کسی قوم کے اولین آثار انحطاط کا مطالعہ کرنا ہو تو اس قوم کی زبان پر نظر ڈالیے، آپ پر یہ حقیقت جلد منکشف ہو جائے گی کہ قومی زوال کی ابتداء ہمیشہ زبان کے زوال سے ہوئی ہے۔"

جب سے مسلمانوں نے برصغیر میں قدم رکھا اسی وقت سے مقامی زبانوں پر ہندی و فارسی کے اثرات مرتب ہونا شروع ہو گئے۔

مسلمانوں نے جب اردو کو اپنے لیے چن لیا تو اس میں عربی و فارسی کے دخیل الفاظ کا حصہ بھی زیادہ ہو گیا۔

برصغیر کے مسلمانوں کی اپنی سماجی زندگی کا ایک خاص نہج تھا اور زندگی کے کچھ رسوم و رواج اور کچھ تقاضے بھی تھے۔ مسلمانوں نے اپنی ظاہری و باطنی اور انفرادی و اجتماعی زندگی کے ہر پہلو کی عکاسی اور ترجمانی کا اہل بنانے کے لیے اردو زبان کو عربی و فارسی کے کثیر تعداد الفاظ، اصطلاحات، محاورات، تلمیحات اور اسالیب بیان عطا کر دیے۔ مختلف اصناف مثلاً غزل، قصیدہ، مثنوی، رباعی وغیرہ کا اضافہ کیا گیا۔ شعری تنقید کا انداز مستعار لیا گیا۔

مسلمان علماء نے قرآن مجید کا اردو میں ترجمہ کیا اور تفاسیر لکھیں، قرآن و حدیث، فقہ، سیرت، تصوف، اسلامی فلسفے اور تاریخ کے سرمائے کو اردو میں منتقل کیا۔

تاریخ بتاتی ہے کہ دیسی زبانوں میں اردو ہی وہ اکیلی زبان تھی جسے اکبر راج میں اس کے محل والوں نے اپنا لیا تھا، جسے شاہ جہاں نے ہندوستان کے کونے کونے میں پہنچا دیا تھا اور جسے ۱۸۳۲ء میں انگریزوں نے فارسی کی جگہ سرکاری زبان بھی بنا دیا تھا۔ یہی زبان آج پورے برصغیر کے طول و عرض میں سب زبانوں سے زیادہ بولی جاتی ہے۔ اس میں جتنا اسلامی ادب موجود ہے اتنا عربی و فارسی میں بھی مشکل سے مل سکے گا۔ اردو میں جو کچھ مواد اسلامی علوم اور عربی و فارسی زبان و ادب سے متعلق ہے اس کی تہ میں مسلم ہند کی تاریخ اور تہذیب کے معتبر شواہد ملیں گے۔ لاہور، ملتان، دہلی، گجرات اور لکھنؤ وغیرہ مراکز ایسے تھے جہاں ہندوستان اور بیرون ہند کے علماء و فضلاء علوم کی تحقیق و تدقیق میں معروف ہوئے۔ یہ روایت صدیوں تک قائم رہی۔ اسی وجہ سے دہلی جو دار السلطنت تھا، اس نے علمی اور تہذیبی ترقی کے اعتبار سے بغداد اور قرطبہ کو بھی دھندلا کر دیا۔

ڈاکٹر تارا چند لکھتے ہیں:

"نئی زبان (اُردو) میں اس شدید قسم کی کشش تھی کہ اس نے جلد ہی عوام میں قبولیت کا درجہ حاصل کر لیا تھا۔ پھر مسلمان صوفیا نے اس زبان کے ذریعے اسلام کو پھیلانا شروع کیا تو یہ اور بھی مقبول ہو گئی لیکن انیسویں صدی کے آغاز میں اردو کی یہ مقبولیت انتہاء پسند ہندوئوں کو انتہائی ناگوار گزری"۔

زبان اور رسم الخط کا تعلق بھی روح اور قالب سے کم نہیں۔ رسم الخط تلفظ کا تابع ہوتا ہے اور اس کا ہر حرف ایک جداگانہ آواز کی نیابت کرتا ہے۔ یہ درست ہے کہ ابتداً زبان صرف اصوات کا نام ہوتا ہے اور اشکال ثانوی حیثیت رکھتی ہیں لیکن حروف یعنی الفاظ کی تحریری شکلیں بھی اتنی ہی اہم ہوتی ہیں جتنی کہ اُن کی آوازیں۔ زبان اور رسم الخط کا مکمل اور مناسب اجتماع و امتزاج زبان کو زندہ اور

پائندہ بناتا ہے اس لیے کسی زبان کو اس کے رسم الخط سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ زبان رسم الخط کے بغیر مکمل نہیں ہوتی بلکہ ادھوری رہتی ہے۔

برصغیر میں اردو ہندی تنازع کا اصل محرک رسم الخط کی تبدیلی تھا۔ ہندو اردو زبان کے لیے دیوناگری رسم الخط رائج کرنا چاہتے تھے اگر ایسا ہو جاتا تو مسلمانوں کو ان کے شاندار ماضی، معاشرتی روایات اور تہذیبی و ثقافتی سرمائے سے دست بردار ہونا پڑتا۔

اردو رسم الخط ایک مبسوط تاریخ رکھتا ہے۔ رسم الخط قوموں کے لسانی مزاج کا آئینہ دار ہوتا ہے اور اس سے ایک قوم کے مخصوص تہذیبی نقوش کا پتہ چلتا ہے جب تک اردو زبان دیوناگری میں قلم بند ہوتی رہی۔ ہمالیہ کی فصیل پار نہ کر سکی لیکن عربی و فارسی رسم الخط میں منتقل ہونے کی دیر تھی کہ اسے ہندوستان کی سرحدوں کو پھلانگ کر ایران و عربستان کی زبانوں اور ان کے بولنے والوں سے تعارف و ملاقات کا موقع بھی ہاتھ آ گیا۔

فورٹ ولیم کالج وہ واحد ادارہ تھا جہاں سب سے پہلے پنڈت للولال جی نے اردو ہندی تنازع کا آغاز کیا۔ انگریزوں کی پالیسی "لڑائو اور حکومت کرو" ان کے روز اول سے ہی کارفرما تھی۔ ہندوئوں کو اردو زبان اس لیے ناگوار تھی کہ اس کا ظاہری پیکر فارسی اور عربی تھا اور وہ مہاتما گاندھی کے بقول قرآن کے حروف اور اسلوب کا مالک تھا اور یہ بات تکلیف دہ تھی کہ اردو ابجد کی شکل قرآن کی زبان سے ملتی جلتی تھی۔ شیخ محمد اکرام ہندوئوں کی اردو سے مخالفت اور ناگواری کے حوالے سے لکھتے ہیں! انیسویں صدی کے شروع میں 'فورٹ ولیم کالج' میں للولال جی اور اُن کے ساتھیوں نے نئی ہندی اس طرح پیدا کی کہ اردو زبان سے تمام عربی اور فارسی کے الفاظ نکال دیے اور سنسکرت کے ہندی مآخذ کے الفاظ شامل کر لیے۔ اردو زبان عربی رسم الخط کی حامل تھی اور یہ آہستہ آہستہ پورے برصغیر میں رابطے کی زبان بن گئی۔ چنانچہ ۱۸۳۵ء میں فارسی کی جگہ اردو کو عدالتی زبان بنا دیا گیا۔ گویا یہ اقدام مسلمانوں کی سیاسی اور ثقافتی حیثیت کو تسلیم کرنے کے مترادف تھا۔ انیسویں صدی کے پہلے ربع میں شاہ عبدالقادر دہلوی کے اردو زبان میں سادہ ترجمۂ قرآن کو بہت مقبولیت حاصل ہو رہی ہے تو وہ جل بھن گئے۔ لہٰذا انھوں نے اردو کو بھی مسلمانوں کی طرح ملیچھ قرار دے دیا۔

۱۸۸۲ء میں "ہنٹر ایجوکیشن کمیشن" کی تشکیل کے موقع پر ہندوئوں کو دوبارہ اردو زبان کو نقصان پہنچانے کا موقع میسر آیا۔ اس بار یہ فتنہ پنجاب اور یوپی میں اٹھا۔ سرسید اردو کی حفاظت کے لیے آگے بڑھے اور ہنٹر کمیشن کو باور کرانے میں کامیاب ہوئے کہ یہ مسئلہ لسانی کی بجائے سیاسی رنگ اختیار کر چکا ہے۔

میکڈانل مسلمانوں کے بارے میں بہت متعصب تھااس سے مسلمانوں سے غداری کی بو آتی تھی۔یوپی کے مشہور متعصب وزیر تعلیم مسٹر سمپورنانند نے اپنی اردو دشمنی کا بڑاسبب یہ بتایا تھا کہ "جب میں گھر گیا تو میری لڑکی نے بھگوان کی بجائے خدا کہا" مسلمانوں کے عقیدے کے الفاظ اردو زبان کے ذریعے ہندوئوں کے دماغوں میں داخل ہو گئے اور اس سے ان کے مذہبی عقیدے متاثر ہونے کا خطرہ ہے۔ مسلم لیگ کے چوتھے اجلاس میں اعلان کیا گیا کہ ہندوئوں کا جس طرح اسلام سے کوئی تعلق نہیں اسی طرح ان کا اردو سے بھی کوئی تعلق نہیں۔

۱۹۳۷ء میں کانگریسی وزارتوں کی تشکیل ہوئی تو تمام ہندو صوبوں کے وزرائے اعلیٰ برہمنوں کو بنا دیا گیا۔اب یہ حال ہو گیا ہے کہ ڈاک خانے والے اردو میں تحریر کردہ منی آرڈر بھی قبول نہ کرتے اور خطوط کو مکتوب الیہ تک پہنچانے سے انکار کر دیا۔

بانیٔ پاکستان قائدِ اعظم محمد علی جناح اردو کو پاکستان کی قومی زبان کی حیثیت سے بلند مرتبے پر دیکھنا چاہتے تھے۔انھیں اردو کی اہمیت اور قوت کا اندازہ تھا۔یہی وجہ ہے کہ انھوں نے پاکستان اور اردو زبان، دونوں کا بیک وقت مقدمہ لڑا۔مصور پاکستان نے بھی اردو دوستی کا حق خوب نبھایا۔بابائے اردو مولوی عبدالحق نے ۱۹۳۶ء میں اردو کانفرنس منعقد کی باصرار علامہ محمد اقبال کو شرکت کی دعوت دی۔ علامہ بیمار تھے۔آپ نے جواب لکھا اگر اردو کانفرنس کی تاریخوں تک میں صحت یاب ہو گیا تو انشاءاللہ ضرور حاضر ہوں گا۔اگر حاضر نہ بھی ہو سکا تو یقین جانیے کہ اس معاملے میں کلیتاً آپ کے ساتھ ہوں۔

مسلمانوں نے پشاور و کشمیر سے لے کر راس کماری تک اور سندھ بلوچستان سے لے کر بنگال اور آسام تک اپنے قول و فعل سے اردو کی اس عمومی اور اجتماعی حیثیت کو جانا اور مانا ہے۔اس لیے سردار عبدالرب نشتر نے کہا تھا:

"واقعاتی اور تاریخی نقطۂ نگاہ سے یہ حیثیت اردو ہی کو حاصل ہے کہ وہ پاکستان کی قومی زبان ہے۔اپنا علیحدہ وطن بنائیں۔ان میں سے ایک اہم چیز یہ تھی کہ ہم اردو کو اغیار کی دست برد سے محفوظ کر دیں"۔

مدیر ادبی دنیا مولانا صلاح الدین اردو زبان کے تاریخی کردار کے بارے میں لکھتے ہیں:

"اردو ہمارے باہمی ارتباط کی سب سے مؤثر اور زندہ جاوید زبان ہے۔ہمارے ہزار سالہ تمدن کی امین اور ہماری مذہبی، ثقافتی اور علمی روایات کی سرمایہ دار ہے"۔

پروفیسر غازی علم الدین لکھتے ہیں:

"میرے نزدیک اردو زبان، اس کا رسم الخط اور املاء عقیدے کا مسئلہ ہے۔ برصغیر میں اردو کسی کی مادری زبان ہو یا نہ ہو یہ ہر مسلمان کی مذہبی اور ثقافتی زبان ضرور ہے اور عربی و فارسی کے بعد اسلامیان ہند کی واحد ترجمان ہے"۔

میرے خیال میں اردو زبان شروع سے لے کر آخر تک بلکہ ہمیشہ ہی ہمارے لیے ایک واحد اظہار کا ذریعہ ہے جس سے ہم اپنے من و عن خیالات، احساسات اور تصورات کو لفظی پیکر میں بیان کرنے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔

تحریکِ پاکستان میں اُردو زبان کا حصہ

تحریکِ پاکستان برصغیر پاک وہند کے مسلمانوں کی لازوال قربانیوں، بے مثال جذبے اور انمول جد وجہد کی داستان ہے-تاریخ اسلام اس بات کی گواہ ہے کہ مسلمان ہر عہد میں اپنی الگ شناخت کے ساتھ اقوامِ عالم میں رہے- عروج وزوال اور شکست وریخت کے کئی ادوار اور زمانے اس قوم نے دیکھے لیکن کبھی مایوسی یا قنوطیت مستقل طور پر مسلمانوں کو کلمۃ الحق کہنے سے نہ روک سکی-تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ ہر عہد میں مسلمان باقی مذاہب اور نظریات کے ماننے والوں سے تعداد میں کم ہونے کے باوجود اپنی منفرد شناخت کے ساتھ رہے- برصغیر میں بھی مسلمانوں کو عروج کے بعد زوال کا سامنا کرنا پڑا- یہاں پر مسلمانوں کو بیک وقت جن دو دشمن قوتوں کا سامنا تھا ان میں ایک انگریز سامراج اور دوسرا ہندو سامراج تھا-1857ء کی جنگِ آزادی بظاہر مسلمانوں اور ہندوؤں نے مل کر برطانوی راج کے خلاف لڑی تھی جس میں کامیابی نہ ہو سکی- مسلمانوں کی وسعتِ قلبی اور امن پرستی اس بات کی دلیل ہے کہ عرصہ دراز تک مسلمان ہندوؤں کے ساتھ مل کر برطانوی نوآبادیاتی نظام سے چھٹکارا حاصل کرنے کی سعی کرتے رہے- لیکن وقت نے آخر کار ظاہر کر دیا کہ ہندو مسلمانوں کے حمایتی نہیں بلکہ وہ تو فقط اپنی ''اکھنڈ بھارت سوچ'' کے تحت مسلمانوں کو استعمال کرتے رہے اور درحقیقت اس نے مسلمانوں کے ساتھ آستین کے سانپ کا سلوک برتا-انگریز تو پہلے ہی مسلمانوں کی شناخت کو ختم کرنے کے درپے تھے-اس ضمن میں اس نے کوئی حربہ نہ چھوڑا تھا، انگریزوں کی مسلمان دشمنی صرف ہندوستان کے سیاسی حالات کی وجہ سے نہ تھی بلکہ رومن ایمپائر کی شکست سے صلیبی جنگوں تک اور قسطنطنیہ سے لے کر اندلس تک پھیلی ہوئی تاریخ سے اثر وفروغ پاتی تھی-

1857ء کے بعد جب ہندوؤں کو واضح ہوا کہ وہ کبھی متحدہ ہندوستان پر اپنا راج قائم نہیں کر سکتے تو انہوں نے مکار سوچ کو بروئے کار لاتے ہوئے انگریز سرکار کی قربت حاصل کر لی اور انگریزوں کو مسلمانوں کے خلاف مزید اکسانا شروع کر دیا جس کا جواز وہ یہ پیش کرتے تھے کہ 1857ء کی بغاوت مسلمانوں نے کی تھی جو کہ سراسر ان کا من گھڑت جھوٹ تھا-ہندوؤں نے جلد ہی برطانوی راج کو مسلمانوں کے خلاف نبرد آزما ہونے کے لیے آمادہ کر لیا اور دوسری طرف ہر وہ حربہ استعمال کیا جس سے مسلمانوں کی شناخت ختم ہو- ہندوؤں نے یہ جنگ ہر محاذ پر لڑی-انہوں نے اقتصادی ومعاشی، تہذیبی وثقافتی، علمی وادبی الغرض ہر میدان میں مسلمانوں کی بالواسطہ اور بلاواسطہ شناخت کو ختم کرنے کی کمر توڑ کوشش کی-اردو زبان جس کا ضمیر مسلمانوں کی آمد سے برصغیر کی بولیوں اور مسلمانوں کی زبانوں عربی، تُرکی اور فارسی کے امتزاج سے تیار ہوا تھا اور مسلمانوں کے عہدِ حکومت میں ہی اس زبان نے پرورش

پائی،اپنے ارتقائی سفر کو طے کیااور مسلمانوں کے دورِ سلطنت میں ہی برصغیر کی مقبول ترین زبان بن کر ابھری اور مسلمانوں کی شناخت بن گئی- کیونکہ اس زبان میں کثیر تعداد عربی اور فارسی الفاظ کی تھی اوراس کا رسم الخط بھی عربی اور فارسی کی طرز پر تھا-اس وجہ سے کم فہم اور تنگ نظر ہندوؤں نے اس کو مسلمانوں کی زبان کہہ کر اس کے مقابلے میں ہندی کو لا کھڑا کیا-تاریخ پاکستان کے طالب علم جانتے ہیں کہ قیامِ پاکستان کی بظاہر وجوہات میں اردو ہندی تنازعہ بھی ایک اہم اور بنیادی وجہ تھی-زبان ایک ثقافتی عنصر ہے-کسی قوم کی زبان اس کے مافی الضمیر کے اظہار اور اس کی تہذیب و ثقافت کی علمبردار ہوتی ہے- برصغیر میں رہنے والے مسلمانوں کی انیسویں اور بیسویں صدی میں زبان اردو ہی تھی- کیونکہ برطانوی سامراج کی آمد سے فارسی زبان کا خاتمہ ہو چکا تھا-اب مسلمان اپنی آواز جس میں زبان میں بلند کر رہے تھے وہ اردو ہی تھی جو عوام اور خواص ہر دو میں مقبول تھی-

اردو زبان کے ساتھ لگاؤ اور انس شروع ہی سے مسلمانوں میں موجود تھا-حضرت امیر خسرو، مسعود سعد سلمان سے لے کر ولی دکنی اور میر و غالب جیسے شاعر اسی زبان سے وابستہ تھے-اسی طرح مسلمانوں کے عربی اور فارسی علم و ادب کا اب اردو زبان میں ترجمہ ہو رہا تھا-اس سرمائے اور اپنی شناخت کی حفاظت مسلمانوں کا ملی اور قومی فریضہ تھا-دوسری طرف تنگ نظر ہندو سوچ اردو زبان کے خاتمے اور ہندی کو فوقیت دلانے سے دو قومی نظریے کے واضح ثبوت مہیا کر رہی تھی-

اردو زبان کے خلاف اس محاذ آرائی کا آغاز بنارس سے ہوا پھر الٰہ آباد میں ایک مجلس قائم کی گئی-رفتہ رفتہ اس کیلیے کمیٹیاں، مجلسیں اور سبھائیں مختلف ناموں سے قائم ہو گئیں-اس میدان میں بالخصوص تعلیم یافتہ ہندو طبقہ تھا-اس ضمن میں محمد علی چراغ اپنی کتاب اکابرینِ تحریک پاکستان میں رقمطراز ہیں:

''سر انتونی میکڈانل نے متحدہ صوبہ جات کا گورنر بنتے ہی صوبہ بہار سے اردو کو ختم کر کے اس کے بجائے ہندی کو سرکاری زبان قرار دے دیا تھا-اس عمل سے مسلمانوں کے جذبات کو شدید ٹھیس پہنچی تھی-اردو چونکہ برعظیم پاک و ہند کے مسلمانوں کی ایک طرح کی شناخت کا ذریعہ تھی اس لئے مسلمانوں نے اس مسئلے سے سنجیدگی سے نمٹنا شروع کیا''-

حوالہ:(محمد علی چراغ،اکابرینِ تحریک پاکستان،لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،ص:213)

اس سازش کے خلاف مسلمانوں کی طرف سے جو پہلا قدم اٹھایا گیا وہ ''اردو ڈیفنس ایسوسی ایشن'' کا قیام تھا-اس کے علاوہ ایک اور اہم ادارہ جس نے اس بے سروسامانی میں اردو زبان کے تحفظ کا بیڑا اٹھایا وہ ''انجمنِ ترقیِ اُردُو'' تھا جو جنوری 1902ء میں قائم ہوا- تحریک علی گڑھ سے وابستہ اہل قلم نے تحفظِ زبانِ اردو میں اہم کردار ادا کیا-اکابرینِ تحریک پاکستان نے اردو زبان کی حفاظت دو قومی

نظریے کی شناخت کے طور پر کی-یہ تنازعہ بیسویں صدی کے پہلے عشرے میں مسلم لیگ کے قیام کے بعد تک رہا-لیکن آہستہ آہستہ ہندوؤں کو واضح ہو گیا کہ مسلمان بر صغیر کی منفرد شناخت رکھنے والی قوم ہے ان کی تہذیب کو ثقافت کو کبھی پامال نہیں کیا جا سکتا-اس کے ساتھ اردو زبان لسانی اور قومی حوالہ سے مسلمانوں کی وہ شناخت بن چکی تھی جو قیامِ پاکستان تک دشمنوں کو چبھتی رہی-اردو ہندی تنازعہ کا تذکرہ ''بابائے اردو'' مولوی عبدالحق نے ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''بر عظیم میں انگریزوں کی حکومت کے قیام کے بعد جو سب سے بڑا سانحہ ہوا وہ یہ ہے کہ اس ملک میں انہوں محکوم قوم کی زبان سنسکرت اور ہندی ہی کو سب کچھ سمجھ لیا تھا---ہندو اردو کو محض اس لیے رد کرتے تھے کہ یہ مسلمانوں کی زبان تھی اور اس کے علاوہ اردو زبان ہندو سماج کی نمائندگی کرنے کی بجائے اسلامی معاشرت کی نمائندگی کرتی تھی-لہٰذا ہندوؤں نے اس کے مقابلے میں ہندی کو لا کھڑا کیا تھا-حالانکہ اس سے پیشتر بر عظیم کی زبان اردو یا اردو کی کوئی مورد اور مفرس قسم ہی ایک عام زبان تھی-یہی وجہ ہے کہ ایک عہد تک اسی زبان کی ترویج و ترقی اور فروغ کیلیے ہندوؤں، سکھوں، عیسائیوں اور چینیوں نے بھی کام کیا-پھر مسلمانوں میں عام لوگوں سے بڑھ کر صوفیاء کرام نے بھی اس مد میں اہم خدمات انجام دیں-اُردو کو قوت بخشی اور اسے بجا طور پر محفوظ کرنے کا فریضہ ادا کیا-1857ء کے بعد تو چونکہ اردو ہندی تنازعہ اردو اور مسلمانوں کے خلاف ایک بہت بڑا حربہ بن گیا تھا-اس لیے واضح طور پر ہندوؤں کے لیے ہندی زبان اور مسلمانوں کے لیے اردو زبان ان کی دو سیاسی امتیازی نشان اور قومی علامتیں بن گئی تھیں''-

حوالہ:(ایضاً، ص: 373)

اُردو ہندی تنازعہ لسانی سے بڑھ کر اب سیاسی نوعیت حاصل کر چکا تھا-جہاں پر مسلمان دو قومی نظریہ کی بات کرتے تھے وہاں اُردو زبان کا تحفظ لازمی جزو بن چکا تھا-بالآخر بر صغیر میں مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت مسلم لیگ کا قیام 1906ء میں انہی لوگوں کے ہاتھوں عمل میں آیا جو دفاعِ اردو زبان کے لیے 4 دہائیوں سے لڑ رہے تھے-جن میں نمائندہ نام نواب وقار الملک، نواب محسن الملک، مولانا محمد علی جوہر اور مولانا ظفر علی خان وغیرہ کے ہیں-آریہ سماج تحریک جو دفاعِ ہندی اور مخالفتِ اردو میں پیش پیش تھی مسلم لیگ کے قیام کی بنیادی وجہ بنی-اس عہد کے بر صغیر میں اردو کے علاوہ بھی بہت سی علاقائی زبانیں اور بولیاں بولی جا رہی تھیں-جن میں پنجابی، سرائیکی، پشتو، سندھی، بلوچی، ہندی اور بھاشا وغیرہ تھیں لیکن بر صغیر کے مسلمانوں کی اجتماعی طور پر نمائندہ زبان ''اُردو'' ہی تھی-اُردو زبان کا تحریکِ پاکستان میں حصہ روزِ روشن کی طرح عیاں ہے-اگر یہ کہا جائے کہ اردو زبان اور دو قومی نظریہ لازم و ملزوم تھے تو بجا ہو گا-اس ضمن میں ڈاکٹر مجیب احمد اپنے ایک مقالہ میں رقم طراز ہیں:

''قیامِ پاکستان سے قبل بر صغیر کے طول و عرض کے خطے اور مختلف علاقائی زبانیں رکھنے کے باوجود الگ وطن کے لیے اُردو کو بحیثیت قومی زبان تسلیم کرتے ہوئے مسلمانانِ ہند نے تحریکِ پاکستان میں بھرپور حصہ لیا اور قیامِ پاکستان کو ممکن بنایا- تحریکِ پاکستان کے دوران الگ زبان ''اردو'' دو قومی نظریے کا ایک بڑا اور بنیادی حوالہ تھی''-

مسلم لیگ کے متعدد اجلاسوں میں اردو زبان کی ترقی، تحفظ اور اس کو قومی زبان تسلیم کرنے کے لیے قرار دادیں منظور ہوئیں- مسلم لیگ کی 4 دہائیوں پر مشتمل جدوجہد کا نتیجہ پاکستان ہے- تحریک پاکستان کے پورے سفر میں رابطہ کی زبان اردو رہی- عوام الناس تک مسلم لیگ کا پیغام زیادہ تر اردو زبان میں ہی پہنچتا تھا- قائدِ اعظمؒ جو کہ اردو زبان سے زیادہ علاقہ نہ رکھتے تھے- آپؒ بھی اکثر اپنی تقاریر میں اردو زبان کو استعمال فرماتے تھے- ایک طرف حکومتِ برطانیہ تک پیغام رسانی کیلیے مسلم لیگ کی طرف سے اہم خبریں انگریزی زبان میں شائع ہوتی لیکن عوام الناس کے لیے ان کا اُردو ترجمہ بھی کیا جاتا تھا- جس کی واضح مثال قرار دادِ لاہور (قرار دادِ پاکستان) کی ہے جس کا متن انگریزی زبان میں تھا- لیکن عوام الناس کی سہولت کے لیے جلسہ کے دوران ہی مولانا ظفر علی خان نے قرار داد کا اردو ترجمہ بھی پیش کیا- مصورِ پاکستان حضرت علامہ اقبال سے لے کر بانیٔ پاکستان قائدِ اعظم تک تحریک پاکستان کا ہر فرد اردو زبان سے محبت کرتا تھا اور اس زبان کی ترقی اور تحفظ کے لیے برسرِ پیکار رہا- قرار دادِ پاکستان کا تاریخی جلسہ جس نے پاکستان کی دھندلی تصویر کو بالکل عیاں کر دیا تھا اس جلسہ کے سٹیج پر جو مسلمانوں کے لیے پیغام لکھا گیا تھا وہ بھی مصورِ پاکستان کا اردو زبان میں یہ شعر تھا:

جہاں میں اہلِ ایماں صورتِ خورشید جیتے ہیں

ادھر ڈوبے ادھر نکلے، ادھر ڈوبے ادھر نکلے

ایک طرف تحریک پاکستان میں عوامی رابطہ کی زبان اردو تھی اور تقاریر، جلسے اور ریلیوں میں نظریہ پاکستان کی تبلیغ بھی اسی زبان میں ہو رہی تھی جبکہ دوسری طرف ادبی محاذ پر بھی ہمارے شاعر اور ادیب اردو زبان میں نظریہ پاکستان کا تحفظ کر رہے تھے- معروف دانشور ڈاکٹر معین الدین عقیل لکھتے ہیں:

''برعظیم کے مسلمانوں میں اجتماعی روح پیدا کرنے، ان کے ملی اور قومی شعور کو بیدار کرنے، اسے تقویت دینے اور سیاسی انتشارات کی مختلف تباہیوں اور بربادیوں کے بعد ان کے مردہ دلوں کو حرارت سے آشنا کرنے میں اردو زبان و ادب نے جو اہم کردار ادا کیا، وہ بہت مؤثر اور نتیجہ خیز ثابت ہوا''-

حوالہ: (ڈاکٹر معین الدین عقیل، مسلمانوں کی جدوجہدِ آزادی، لاہور: مکتبہ تعمیرِ انسانیت، 1984، ص:206)

''انقلاب زندہ باد'' سے ''لے کر رہیں گے پاکستان، بن کے رہے گا پاکستان''تک کے نعرے اردو زبان میں لگائے جاتے رہے اور اسلامیانِ ہند کی دھڑکنوں کا ترانہ ''مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ'' بھی اُردو زبان میں گائے جاتے رہے-اُردو زبان کے ان شاعروں اور ادیبوں کی فہرست طویل ہے جنہوں نے تحریک پاکستان میں اپنے قلم کے ذریعے کردار ادا کیا-ان میں سے بہت ہی اہم شخصیات اور ان کی خدمات ہیں جو انہوں نے اردو زبان میں دیں، کو بطور حوالہ دیا جاتا ہے- تحریکِ پاکستان میں اردو زبان کے جس شاعر کا سب سے اہم اور ناقابلِ فراموش کردار رہا وہ مصورِ پاکستان ڈاکٹر علامہ محمد اقبالؒ ہیں-ان کی نظم و نثر نظریہ پاکستان کی عکاس اور محافظ ہے- بالخصوص آپؒ نے اپنی اردو شاعری کے ذریعے مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کر کے نویدِ صبح کا پیغام دیا- مسلمانوں پر آنے والے کٹھن حالات بھی واحد امید کی آواز حکیم الامتؒ کی ہی تھی-

اگر عثمانیوں پر کوہِ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے

کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

آپؒ نے اپنے کلام کے ذریعے مسلمانوں میں عشقِ مصطفےٰ(ﷺ) کے جذبہ کو پیدا کیا اور ان کو اپنی حقیقت سے آگاہ ہونے کا درس دیا-آپؒ کا کلام فارسی میں بھی ہے لیکن جو پذیرائی آپ کے اردو کلام کو تحریک پاکستان کے دوران ملی وہ اپنی مثال آپ ہے-آپؒ کے اردو اشعار اور کلام کو ترنم کے ساتھ جلسوں میں پڑھا جاتا تھا-اس کے علاوہ نظریہ پاکستان کے مقررین آپؒ کے اشعار کے سہارے لوگوں کے جذبات اور حوصلوں کو بڑھاتے تھے- جس طرح مسلمانوں کی نمائندہ سیاسی جماعت کے بنیاد گزار اردو زبان سے وابستہ شاعر اور ادیب تھے اسی طرح مسلمانوں کے لیے علیحدہ سلطنت کا پہلی بار مطالبہ بھی اردو زبان کے عظیم الشان شاعر علامہ محمد اقبالؒ نے 1930ء میں کیا-علامہ اقبال کی فکر و ولولہ سے لبریز شاعری نے مسلمانانِ برعظیم کے اجتماعی سیاسی شعور کو جِلا بخشی-انہیں فکر و عمل کی نئی نئی راہیں دِکھائیں-علامہ اقبال کے انقلابی افکار نے مسلمانوں کو حریت پسندی اور آزادی کا سبق دیا اور انہیں زندگی کا شعور بخشا ہے-

علامہ اقبالؒ کے بعد جس شاعر کا نام اس ضمن میں اہم ہے وہ رئیس المتغزلین مولانا حسرت موہانی ہیں؛ آپ تحریکِ پاکستان کے بڑے جوشیلے اور جذباتی جانثار تھے-آپ بیک وقت سیاسی راہنما ہونے کے ساتھ اُردو زبان کے اعلیٰ پائے کے شاعر بھی تھے-انہوں نے اپنی شاعری میں برطانوی سامراج کے خلاف بڑی بے باکی سے لکھا جس کی وجہ سے آپ کو کئی بار جیل بھی جانا پڑا-

ہے مشقِ سخن جاری چکی کی مشقت بھی

اک طرفہ تماشا ہے حسرت کے طبیعت بھی

ہر چند ہے دل شیدا حریت کامل کا

منظور دعا لیکن ہے قید محبت بھی

شاعری کے ساتھ ساتھ آپ صحافتی میدان میں بھی وہ سر گرمِ عمل رہے-وہ اردو زبان میں اپنا پرچہ ''اردوئے معلیٰ'' نکالتے تھے-جس میں حریت، حب الوطنی اور انگریز حکومت سے آزادی کے متعلق مضامین چھپتے تھے-آپ نے اردو نظم و نثر کے ذریعے نظریہ پاکستان کا پرچار بری جرأت اور بے باکی سے کیا-آپ مسلم لیگ کی طرف سے اسلامی دنیا اور مشرقی و مغربی یورپ میں بطور سفیر بھی گئے-مولانا ظفر علی خان نے بھی اردو شاعری اور صحافت کے ذریعے تحریک پاکستان میں اہم کردار ادا کیا-آپ مسلم لیگ کے بنیاد گزاروں میں ہونے کے ساتھ ساتھ قائدِ اعظمؒ کے دستِ راست رہے-آپ پر جوش مقرر اور شعلہ بیان مقرر تھے-اس عہد کے سب سے زیادہ اشاعت والے اردو اخبار ''زمیندار'' کو آپ کی سرپرستی حاصل تھی-اردو زبان میں شائع ہونے والا یہ اخبار تحریک پاکستان کے دوران مسلم عوام کی امنگوں اور امیدوں کا حقیقی ترجمان تھا-اس اخبار پر بھی انگریز حکومت نے پابندیاں عائد کیں اور مولانا ظفر علی خان کو جیل کی سزا بھی بھگتنا پڑی-لیکن ''زمیندار'' اخبار حصولِ پاکستان تک مسلمانوں کے جذبات اور احساسات کی ترجمانی کرتا رہا- ''زمیندار'' پر پابندی کے دوران آپ سیاسی مقاصد کے لیے ''ستارہ صبح'' کے نام سے بھی اخبار اردو زبان میں شائع کرتے رہے-اس کو بھی بہت پذیرائی حاصل ہوئی-آپ شعر و ادب سے بھی گہرا شغف رکھتے تھے-آپ کو نظم و نثر دونوں میں مہارت حاصل تھی-آپ کی اردو زبان میں لکھی گئی سیاسی اور اسلامی موضوعات شاعری نے مسلمانوں کے جذبی آزادی کو پروان چڑھانے میں اہم کردار ادا کیا-مولانا کا مشہورِ زمانہ شعر آج بھی قوتِ ایمانی میں اضافے کا سبب بنتا ہے:

فضائے بدر پیدا کر فرشتے تیری نصرت کو

اتر سکتے ہیں گردوں سے قطار اندر قطار اب بھی

ان کے علاوہ مولانا الطاف حسین حالی کا نام بھی اس ضمن میں خاص اہمیت کا حامل ہے-ان کی نظم ''مد و جزر اسلام'' جو مسدس حالی کے نام سے مشہور ہے نے قومی حمیت کو بیدار کرنے اور اقدارِ اسلامی کو اپنا کر دوبارہ زندہ قوم بننے کا درس دیا-اس کے علاوہ آپ نے مشاہیرِ اسلام کی اردو زبان میں سوانح عمریاں لکھیں جو مسلمانوں کیلیے اپنے قائدین سے آگہی کا بہترین سبب بنیں-

مولانا امام احمد رضا خان بریلویؒ کی اُردو شاعری نے بھی اسلامی فکر کے نئے دریچے کھولے، ایسے ایسے گلہائے عقیدت نکھارے کہ مدحتِ مصطفےٰ (ﷺ) میں اہلِ ایمان کے قلوب گرما دیئے- عربی زبان کی نعت گوئی میں جو مقام صاحبِ قصیدہ ''البردہ'' امام بوصیریؒ کو نصیب ہوا، فارسی زبان میں امام عبدالرحمان جامیؒ کے فنِ سُخن کو عطا ہوا اور زبانِ اُردو میں وہی مقام امام احمد رضا خان کے حصہ میں آیا- ان کا لکھا ہوا سلام پاک و ہند کے مسلمانوں کا مقبول ترین سلام بن گیا، جسے بلا شُبہ اردو زبان کا ''قصیدہ بردہ'' کہا جاتا ہے-

مصطفےٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام
شمعِ بزمِ ہدایت پہ لاکھوں سلام
شبِ اسریٰ کے دولہا پہ دائم درود
نوشہء بزمِ جنّت پہ لاکھوں سلام
جس سُہانی گھڑی چمکا طیبہ کا چاند
اُس دل افروز ساعت پہ لاکھوں سلام

طوالت کے باعث تحریک پاکستان میں اہلِ اردو زبان کے کردار اور حصے کو فرداً فرداً زیرِ بحث لانا ممکن نہیں اس لیے اردو زبان و ادب سے تعلق رکھنے والے ان مشاہیر کے نام درج کیے جاتے ہیں جنہوں نے اردو زبان کو ذریعہ اظہار بنا کر تحریک پاکستان میں اپنا کردار ادا کیا-

اردو شاعری کی طرح اردو نثر نے بھی تحریک پاکستان میں بے مثال حصہ ڈالا- اردو زبان کے جن ادیبوں نے نظریہ پاکستان کے پرچار کے لیے نثری تحریریں لکھیں ان میں عبدالحلیم شرر، نواب محسن الملک، مولانا محمد علی جوہر، مولانا ظفر علی خان، عبدالمجید سالک، مولوی عبدالحق اور احمد ندیم قاسمی وغیرہ کے نام اہم ہیں- ان لوگوں نے مضامین، ناول، افسانہ، ڈراما اور کالم کے ذریعے مسلمانوں کو دو قومی نظریے اور ان کے درخشندہ ماضی سے آگہی بخشی-

تحریک پاکستان کے دوران صحافتی میدان میں بھی اردو زبان کا حصہ ناقابلِ فراموش ہے- اردو زبان میں بے شمار اخبارات، رسائل اور جرائد شائع ہوتے رہے جو نظریہ پاکستان اور تحریک پاکستان کی تائید میں تھے- ان اخبارات اور رسائل میں تہذیب الاخلاق، آگرہ

اخبار، ردِ عیسائیت، شمس الاخبار، ناصر الاخبار، احسن الاخبار، دلگداز، اتحاد، مہذب، پیسہ، وکیل، اردوئے معلیٰ، زمیندار، الہلال، ہمدرد، کامریڈ، ایمان، احسان، منشور، تنویر، نوائے وقت، سرحد، ملت، الاسلام، جمہور اور تنظیم کے نام قابل ذکر ہیں-اس ضمن میں ڈاکٹر معین الدین عقیل لکھتے ہیں:

''یہ اخبارات ان لاتعداد اخبارات میں سے ہیں جنہوں نے مسلمانوں کی تحریکیوں کو وسعت اور کامیابی سے ہمکنار کیا-ان میں قومی اور ملی شعور اجاگر کیا اور حصولِ پاکستان کی اہمیت اور ضرورت کی وضاحت کی''-

حوالہ:(ایضاً، ص:205)

مذکورہ بالا تمام اخبارات اور رسائل و جرائد اردو زبان میں شائع ہوتے تھے- تحریک پاکستان میں اردو شاعری اور افسانوی و غیر افسانوی نثر کا حصہ اظہر من الشمس ہے-

بانیٔ پاکستان قائدِ اعظمؒ بظاہر اردو زبان کا استعمال بہت کم کرتے تھے-وہ اپنی تقریر و تحریر کے لیے زیادہ انگریزی زبان کا استعمال کرتے تھے- لیکن ان کی بصیرت نے اس بات کا اندازہ لگا لیا تھا کہ برصغیر کے مسلمانوں کے اتحاد کیلیے ان کی مشترکہ زبان اردو ہی ہے اور یہ زبان ہی ان کے دل کی آواز ہے کہ اسی زبان میں وہ اپنا مافی الضمیر بیان کرنا پسند کرتے ہیں- قائدِ اعظمؒ کی صدارت میں مسلم لیگ کا پہلا اجلاس 1916ء میں ہوا تو اس میں قرارداد پیش کی گئی کہ اردو زبان کو ملکی زبان تسلیم کیا جائے تو آپؒ کی صدارت میں یہ قرارداد منظور ہوئی-اسی طرح مسلم لیگ کے پچیسویں اجلاس میں جو لکھنو میں منعقد ہوا قائدِ اعظمؒ کے زیرِ نگرانی ایک بار پھر اردو کی حمایت میں قرارداد منظور کی گئی تھی-آپؒ اردو زبان میں خاصی دلچسپی رکھتے تھے اور اس کو سیکھنے کی کوشش بھی کرتے رہے-

''اب تک قائدِ اعظم انگریزی کے ذریعے اظہارِ خیال کرتے رہے تھے- حتیٰ کہ اردو کی حمایت میں انہوں نے جو آواز بھی اٹھائی وہ انگریزی ہی میں تھی-اس کی نمایاں وجہ یہ تھی کہ انہیں انگریزی زبان تو بخوبی آتی تھی، اردو تحریر و تقریر کی کماحقہ صلاحیت نہ تھی- لیکن وہ عظیم لیڈر تھے-وہ جانتے تھے کہ عوام کی زبان اردو ہے--- چنانچہ انہوں نے یہ زبان سیکھنے اور اس میں تقریر کرنے کا ملکہ پیدا کرنے کی پوری پوری کوشش کی اور اس میں انہیں جو کامیابی ہوئی اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ آل انڈیا مسلم لیگ کے چھبیسویں اجلاس میں جو دسمبر 1938ء میں پٹنہ میں ہوا-انہوں نے اپنی انگریزی تقریر کے فوراً بعد اردو زبان میں رواں اور پُر اثر تقریر کی اس اجلاس میں پہلی مرتبہ عوامی سطح پر قائدِ اعظم کی آواز اردو زبان میں گونج اٹھی''-

(ڈاکٹر معین الدین عقیل، منتخباتِ اخبارِ اردو، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، 1988، ص:94)

قائدِ اعظمؒ اردو زبان کے ساتھ لگاؤ رکھنے کے ساتھ ساتھ اس کو برصغیر کے مسلمانوں کی زبان تسلیم کرتے تھے اسی لیے آپؒ نے اپنے مشہور 14 نکات میں بھی مسلمانوں کی زبان (اردو) کے تحفظ کا مطالبہ کیا-انگریزی میں تقریر کرنے کا اصل مقصد انہوں نے اپنی 30 اکتوبر 1947ء کی ریڈیو پاکستان پر تقریر میں واضح فرمادیا:

''اب تک میں نے انگریزی میں تقریر کی ہے-اس کی وجہ یہ ہے کہ اس وقت پوری دنیا کی نگاہیں پاکستان پر لگی ہوئی ہیں اور آزادی کے بعد مختلف اقوامِ عالم ہم میں دلچسپی لے رہی ہیں، لہٰذا میں نے انگریزی کا سہارا لیا تاکہ تمام دنیا کے لوگ ہماری بات سن سکیں''-

حوالہ:(ایضاً)

آپؒ کے اردو زبان سے لگاؤ کا ثبوت اس بات سے بھی ملتا ہے کہ پاکستان میں مختلف علاقائی زبانوں کی موجودگی میں انہوں نے 3 لاکھ سے زائد کے مجمع کے سامنے 21 مارچ 1948ء کو ڈھاکہ میں واضح اعلان فرمایا:

''میں آپ پر یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ پاکستان کی سرکاری زبان صرف اردو ہوگی''-

(ایضاً، ص:95)

اُردو زبان کو قومی زبان قرار دیتے ہوئے آپؒ نے ڈھاکہ میں ہی 24 مارچ 1948ء کو فرمایا:

''ملک کے مختلف صوبوں کے مابین رابطہ پیدا کرنے کیلیے ایک اور صرف ایک ہی زبان قومی زبان قرار پائے گی اور وہ اُردو ہوگی''-

حوالہ:(ایضاً)

پاکستان کے لوگوں نے اپنے قائد کے فرمان کو تسلیم کیا تھا حالانکہ مشرقی پاکستان کے لوگ جہاں پر بنگالی زیادہ بولی جاتی تھی چند ایک شر پسند عناصر کے علاوہ سب نے محمد علی جناحؒ کی اس بات کا خیر مقدم کیا-مشرقی پاکستان کے لوگوں کی قائدِ اعظم اور مادرِ ملت سے محبت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ 1965ء کے صدارتی انتخابات میں فاطمہ جناح کو ڈھاکہ سے زیادہ برتری حاصل ہوئی تھی کہ ایوب خان کے مقابلہ میں مادرِ ملت کو 154 ووٹوں کی اکثریت حاصل ہوئی-باقی پاکستان کے ان فرمودات سے بھی اردو زبان کے تحریکِ پاکستان میں نمایاں حصہ کی تصدیق ہوتی ہے کہ جو زبان تحریک پاکستان میں ذریعہ ابلاغ اور مسلمانوں کی نمائندہ رہی باقی پاکستان نے اسی کو پاکستان کی قومی اور سرکاری زبان کا درجہ دیا-

آج ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم اپنی قومی زبان کے تحفظ اور ترقی کے لیے ممکنہ وسائل کو بروئے کار لائیں اور آئینِ پاکستان کے آرٹیکل 251 پر عمل کرتے ہوئے اردو کو پاکستان میں بطور سرکاری زبان لاگو کریں-

ابھی تہذیب کا نوحہ نہ لکھنا

ابھی کچھ لوگ اردو بولتے ہیں

اردو اور دیگر پاکستانی زبانیں

زبان انسان کی سماجی اور معاشرتی ضرورتوں کی ایجاد ہے۔ ہر زبان اپنی ارتقائی منزلیں سماجی زندگی ہی کے سہارے طے کرتی ہے اور اس کے زیر اثر اس کی صورت اور معنی میں تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ کسی زبان کے عروج و زوال کی داستان کو دراصل کسی قوم کے عروج و زوال کی تاریخ سمجھنا چاہیے۔ بات یہ ہے کہ زبان بھی اپنے بولنے والوں کی طرح اپنے سماجی محرکات و عوامل کی پابند ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں جس طرح افراد یا کسی قوم و ملک کے لیے ضروری ہے کہ وہ نہ صرف اپنے ہمسایہ ملکوں یا قوموں سے بلکہ دور دراز کے ملکوں اور قوموں سے بھی زیادہ سے زیادہ تعلقات و روابط قائم کرے بالکل اسی طرح کسی زندہ زبان کے لیے بھی ضروری ہے کہ دوسری زبانوں سے اس کا ربط و ضبط بڑھتا رہے اور ایک دوسرے سے اخذ و استفادہ اور ترجمے کی راہیں کشادہ ہوتی رہیں۔ اس کے بغیر نہ کوئی قوم بین الاقوامی مسائل میں اپنا کردار ادا کر سکتی ہے اور نہ کوئی زبان۔ اس لیے زبانوں کا ایک دوسرے سے استفادہ کرنا ناگزیر ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ دنیا کی ترقی یافتہ سے ترقی یافتہ زبان بھی اس بات کا دعویٰ نہیں کر سکتی کہ وہ دوسری زبانوں کے اثرات یا الفاظ سے یکسر خالی ہے۔ اردو زبان بھی اس قانونِ فطرت سے مستثنیٰ نہیں ہے بلکہ اس کی تو بنیاد ہی آس پاس مختلف زبانوں یعنی پنجابی، ہندی، خروشتی، سندھی، پشتو، بلوچی اور سرائیکی وغیرہ کے اشتراک پر رکھی گئی ہے۔ بعد میں اس نے عربی، فارسی، انگریزی اور ترکی کے بھی بے شمار الفاظ اپنے اندر جذب کر لیے اور آج وہ اپنے مزاج اور اپنی ساخت کے لحاظ سے زبانوں کی ایک ایسی انجمن ہے جس میں شرکت کے دروازے ہر زبان کے الفاظ پر یکساں کھلے ہوئے ہیں، خاص طور پر ہندوستانیوں اور پاکستانیوں کے لیے اردو کی سبھا ایک ایسی سبھا ہے جس میں ہر علاقے کے بول صاف پہچان میں آ جاتے ہیں اور ہر شخص کلی طور پر نہ سہی جزوی طور پر ہی یہ ضرور محسوس کرنے لگتا ہے کہ اردو کا خمیر جس مسالے سے تیار کیا ہوا ہے اس میں بعض اجزا اس کے علاقے کے بھی شامل ہیں۔ جزو اور کل کا یہ تعلق معمولی نہیں غیر معمولی ہے۔ مجاز اور حقیقت کے تعلق کے باب میں خواجہ میر دردؔ نے کہا تھا کہ

ہر جزو کو کل کے ساتھ بمعنی ہے اتصال
دریا سے دُر جدا ہے پہ ہے غرق آب میں

یہی بات اردو اور علاقائی زبانوں کے رشتے کے بارے میں کہی جا سکتی ہے۔

اردو اور علاقائی زبانوں کا رشتہ دراصل ایک ہی خون، ایک ہی رنگ و نسل، ایک ہی آسمان، ایک ہی زمین، ایک ہی انداز فکر اور ایک ہی طرز ادا کا رشتہ ہے۔ دور حاضر سے لے کر قدیم تر زمانے تک سراغ لگاتے چلے جایئے یہ رشتے پوری طرح واضح ہوتے چلے جائیں گے۔ صاف اندازہ ہو جائے گا کہ اردو اور علاقائی زبانیں ایک دوسرے کی حریف و رقیب نہیں بلکہ عزیز و رفیق ہیں۔ یہ بھی صحیح نہیں کہ ان میں ماں بیٹی کا رشتہ ہے۔ وجہ یہ ہے کہ نہ تو اردو نے کسی علاقائی زبان کے پیٹ سے جنم لیا اور نہ کوئی علاقائی زبان اس کے بطن سے پیدا ہوئی ہے۔ لسانی نقطہ نظر سے ایسا ممکن بھی نہیں ہے۔ زبان سے زبان جنم نہیں لیتی بلکہ سماجی، علاقائی اور معاشرتی ضرورتوں سے کبھی ایک اور کبھی بہ یک وقت کئی زبانیں وجود میں آجاتی ہیں۔ ہندوستانی اور پاکستانی علاقے کی صورت حال بھی یہی ہے یعنی اردو اور دوسری علاقائی زبانیں ایک ہی ماں کی بیٹیاں ہیں۔ ایک ہی قسم کے ماحول میں انھوں نے یکے بعد دیگرے جنم لیا ہے اور ایک قسم کی فضا میں پروان چڑھی ہیں۔ ان میں جو مشابہت اور مماثلت نظر آتی ہے وہ اسی خاص رشتے کے سبب ہے۔ اردو کے بارے میں ایک غلط فہمی کو بہت ہوا دی گئی ہے وہ یہ کہ اردو کا رشتہ مقامی یا علاقائی زبانوں سے اتنا استوار نہیں جتنا کہ بعض بیرونی زبانوں سے۔ یہ بات کسی نقطۂ نظر سے بھی صحیح نہیں ہے۔ اردو کا صوتی نظام اس کے جملوں کی ساخت، قواعد کے بیشتر اصول اور بول چال کا لب و لہجہ سب پر مقامی اثرات کا غلبہ ہے۔ اردو کے بعض علمی اور ادبی شعبوں پر یقیناً فارسی اور عربی کا گہرا اثر ہے لیکن اس اثر و تاثیر کا تعلق اردو زبان کے مزاج یا باطن سے نہیں بلکہ اس کی اوپری سطح سے ہو رہا ہے۔ اردو شاعری نے وزن، بحر اور بعض اصناف سخن یقیناً عربی فارسی سے لی ہیں، لیکن اپنے اثر، لب و لہجہ اور موضوع کے اعتبار سے اردو کا رنگ و آہنگ عربی، فارسی سے بہت الگ رہا ہے۔ حتیٰ کہ اس علاقے میں عربی و فارسی میں بھی جو کچھ لکھا گیا ہے اسے بھی سبک ہندی کا نام دیا گیا ہے۔ ایسی صورت میں یہ کہنا کہ اردو پر عربی و فارسی کے اثرات مقامی زبانوں کے اثرات سے قوی تر ہیں، صحیح نہیں ہے۔ اردو زبان کا مزاج شروع ہی سے مقامی یا دیسی رہا ہے، اس نے عربی، فارسی، ترکی اور انگریزی سب سے حسب ضرورت فائدہ اٹھایا ہے اور باہر کی زبانوں کے بے شمار الفاظ اپنے اندر جذب کر لیے ہیں، لیکن یہ انجذاب، کیفیت کے اعتبار سے ہمیشہ علاقائی یا مقامی زبانوں سے متاثر رہا ہے۔

اس سلسلے میں ایک اور بات قابل توجہ ہے کہ اردو میں جو الفاظ دوسری زبانوں سے آئے ہیں وہ صرف اسماء تک محدود ہیں۔ ایک وقت تھا کہ مختلف علوم و فنون کے بہت سے اسماء عربی فارسی سے لیے گئے تھے۔ آج ریڈیو، ٹی وی، ہوائی جہاز اور دوسری مشینوں کے توسط سے بے شمار الفاظ انگریزی سے آگئے ہیں۔ ان الفاظ سے صرف پڑھے لکھے لوگ ہی نہیں بلکہ ایک معمولی مکینک بلکہ ٹیکنکل اداروں

کا مزدور بھی خوب واقف ہے لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ اردو میں دخیل الفاظ کا یہ سلسلہ صرف اسماء تک محدود رہا ہے۔ دوسری قسم کے الفاظ یعنی فعل و حرف Verb & Preposition وغیرہ سارے کے سارے مقامی ہیں۔

اسماء کے سلسلے میں بھی ایک وضاحت ضروری ہے کہ عربی و فارسی کے جو الفاظ مستعمل ہیں ان میں بھی بیشتر کا تعلق مخصوص سطح کی علمی اور ادبی زبان سے ہے۔ روز مرہ کی گفتگو میں خواہ اس گفتگو کا تعلق عام آدمیوں سے ہو یا خاص سے زیادہ تر مقامی الفاظ ہی استعمال ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر شکم، انگشت، چشم، گوش اور دست کے الفاظ ہی کو لے لیجیے۔ یہ فارسی سے آئے ہیں اور اردو میں مستعمل ہیں لیکن ان کا مصرف صرف علمی اور ادبی زبان میں ہوتا ہے۔ روز مرہ کی بات چیت میں عوام و خواص سب شکم کی جگہ پیٹ، انگشت کی جگہ انگلی، چشم کی بجائے آنکھ اور گوش کی جگہ کان اور دست کی بجائے ہاتھ کے الفاظ کا استعمال کرتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ اس قسم کے الفاظ اردو میں مفرد بولے ہی نہیں جا سکتے۔ ان کو استعمال کرنے کے لیے انھیں اسی قسم کے دوسرے الفاظ سے مرکب کرنا پڑتا ہے جیسے شکم سیر، انگشت بدنداں، گوش ہوش، چشمِ عبرت اور دست کرم وغیرہ۔ ظاہر ہے اس قسم کے مرکبات کی تخلیق اور ان کا استعمال ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ اردو نے عربی، فارسی یا انگریزی و ترکی سے جو اسماء لیے ہیں، ان میں سے جو اردو کے مزاج کے موافق نہیں تھے انھیں خراد پر چڑھا کر مزاج کے موافق بنا دیا گیا ہے۔ رائو منٹر اور لکشمنٹر، اردو میں راون اور لچھمن ہو گئے ہیں۔ آرڈرلی کو اردلی کر لیا گیا ہے۔ میچ باکس کو ماچس، ہسپتال کو اسپتال، فبرواری کو فروری اور مے کو مئی بنا دیا گیا ہے۔ عربی کے سَیّد جَیّد، سیدھے سادے سیّد جیّد ہو گئے ہیں۔ یہی حال بے شمار عربی، فارسی اور سنسکرت سے آنے والے لفظوں کا ہے تاریدیا اردو بنا لینے کا یہ عمل صرف تلفظ تک محدود نہیں بلکہ الفاظ کے معنی، املا، واحد، جمع اور تذکیر و تانیث کے اصول سبھی میں اس طرح کا تصرف کیا گیا ہے۔ حروف تہجی سے لے کر الفاظ کی ساخت، جملوں کی بناوٹ، صرف و نحو کے قاعدے، الفاظ کے استعمال اور فصاحت و بلاغت تک سب میں اردو کا اپنا ایک منفرد اسلوب اور مخصوص لب و لہجہ ہے۔ وہ کسی بیرونی زبان کی مقلد یا تابع نہیں ہے۔ اس لیے یہ خیال کرنا کہ اردو کا تعلق کسی بیرونی زبان سے ہے یا اس کی جنم بھومی، علاقائی زبانوں سے الگ کہیں اور ہے۔ کسی طرح درست نہیں ہے۔ اردو نے بھی اسی سرزمین پر جنم لیا ہے۔ اس لحاظ سے بھی بدیسی نہیں علاقائی کہنا چاہیے۔ یہ ضرور ہے کہ اردو کے اثر و نفوذ کا علاقہ، علاقائی زبانوں کے مقابلے میں بہت بڑا ہے۔ اس کی یہی بڑائی اردو کو دوسری علاقائی زبانوں یعنی ہندی، بلوچی، سندھی اور پشتو وغیرہ سے بڑا بنا دیتی ہے۔ اس بڑائی پر اردو کو فخر کرنے اور علاقائی زبانوں کو رشک کرنے کا حق ہے لیکن اس فخر و رشک کی بنیاد نفرت و تعصب پر نہیں اخوت و محبت پر ہونی چاہیے۔

میں نے ابھی عرض کیا تھا کہ اردو اور دوسری علاقائی زبانوں کی جنم بھومی ایک ہی ہے۔ اردو، بلوچی، سندھی، پنجابی، پشتو، سرائیکی سب ایک ہی قسم کی تہذیبی زندگی ایک ہی قسم کی معاشرت اور ایک ہی قسم کی آب و ہوا کی زائدہ اور پروردہ ہیں۔ ان کے ظاہری خدوخال ایک دوسرے سے کچھ الگ سہی لیکن بباطن وہ ایک دوسرے سے بہت قریب ہیں۔ ان سب کی روحوں پر اسلامی تہذیب و تمدن اور صوفیائے کرام کے احساس کا سایہ ہے۔ ان کے سرمایۂ علم و ادب اور مزاج و اسلوب میں بھی ایسی قدریں مشترک ہیں کہ وہ ایک دوسرے سے قریب تر ہوتی چلی جارہی ہیں لیکن افسوس کی بات ہے کہ بعض حلقوں کی طرف سے اردو اور علاقائی زبانوں کو ایک دوسرے سے الگ رکھنے اور انھیں ایک دوسرے کی حریف و رقیب ثابت کرنے کی شعوری کوشش کی جارہی ہے۔ یہ کوشش چونکہ ساری زبانوں کے حق میں غیر مفید اور غیر فطری ہے اس لیے کامیاب نہ ہوگی۔ علاقائی زبانیں اردو سے بہت کچھ لے رہی ہیں اور اردو پر علاقائی زبانوں کی اثرپذیری کی رفتار بھی روز بروز تیز ہوتی جارہی ہے۔

اردو اور علاقائی زبانوں کو باہم ملنے جلنے اور ایک دوسرے سے قریب تر آنے کا موقع دراصل جمہوری نظام نے دیا ہے۔ جس میں عوام خود اپنی تقدیر کے خالق و مالک اور حکمران، عوام کی خواہشوں کے تابع بنتے جارہے ہیں۔ یوں بھی زبانوں کے ارتقا کی راہ میں کسی فرد یا ادارے کی حاکمیت کبھی حائل نہیں ہوسکتی۔ زبانوں کا تاریخی مطالعہ ظاہر کرتا ہے کہ دنیا کی ہر زبان میں زندگی کے تقاضوں کے مطابق برابر تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ اس کا لب و لہجہ عہد بہ عہد بدلتا رہتا ہے۔ بہت سے الفاظ متروک و مردہ ہوتے رہتے ہیں۔ ان کی جگہ نئے جاندار الفاظ خود بخود جگہ پاتے ہیں۔ یہ سارا عمل عوامی سطح پر انجانے طور پر ہوتا ہے۔ زبان کی تراش اور حذف و اضافہ میں کسی خاص گروہ یا علاقے کی حاکمیت کو زیادہ دخل نہیں ہوتا۔ کہا جاتا ہے کہ ناسخؔ نے بعض الفاظ متروک قرار دیے تھے اور اپنے شاگردوں کے ذریعے ایک طرح کی تحریک بھی چلائی تھی لیکن یہ تحریک چونکہ غیر فطری تھی اس لیے کامیاب نہ ہوسکی حتیٰ کہ جن الفاظ کو انھوں نے متروک قرار دیا ان میں سے کئی الفاظ خود انہی کے کلام میں لاشعوری طور پر داخل ہوگئے۔ دوسروں پر تو اس کا بہت ہی کم اثر ہوا۔ شہنشاہوں کی طرف سے شراب کی رام رنگی اور سنترہ کو رنگترہ کہنے کا حکم صادر ہوا لیکن عوام نے اسے پسند نہ کیا۔ پاکستان کے سابق صدر محمد ایوب خان (مرحوم) نے صبح و شام ریڈیو سے نشر کرایا کہ مغربی پاکستان کو پچھمو پاکستان اور مشرقی پاکستان کو پوربو پاکستان کہا جائے لیکن کسی نے ایک نہ سنی کہنے کا مطلب یہ ہے کہ زبان پر کسی کی اجارہ داری اور حکمرانی کبھی قائم نہیں رہ سکتی۔ آج کے جمہوری دور میں جیسے جیسے ایک عام شہری کی وزیراعظم سے، ایک ہاری کی زمیندار سے، ایک مزدور کی کارخانے کے مالک سے اور ایک کسان کی جاگیردار سے ملاقات کرنے کے امکانات روشن ہوتے جارہے ہیں۔ ویسے ویسے اردو اور علاقائی زبانوں

کے ملاپ اور باہم اشتراک کی راہیں بھی ہموار ہوتی جارہی ہیں۔ علاقائی زبانوں کا حلقۂ اثر بڑھ رہا ہے۔ ان کے ذخیرۂ الفاظ، موضوعات اور اسالیب بیان سب پر اردو کا اثر بہت نمایاں نظر آرہا ہے۔ اردو پر بھی علاقائی زبانوں کے اثرات پوری طرح رونما ہو رہے ہیں۔ اس کے اسلوب اور لب ولہجہ میں خاصی تبدیلی آچکی ہے۔ یہ تبدیلی کسی کو گوارا ہو یا نہ گوار، عوام کی حاکمیت اس کی پروا نہیں کرتی۔ سمجھنے کی بات صرف اتنی ہے کہ زبان اور اس کے لہجے میں عہد بہ عہد اور مقام بہ مقام تبدیلیاں ہوتی ہوتی رہتی ہیں اور یہی تبدیلیاں جب قبول عام حاصل کر لیتی ہیں تو معیاری زبان کا جزو بن جاتی ہیں۔

اردو زبان موجودہ سماجی زندگی اور علاقائی زبانوں کے زیر اثر کیا رنگ وروپ اختیار کر رہی ہے۔ اس کا اندازہ کرنے کے لیے چند جملے دیکھیے:

۱۔ اس نے آج بہت بور کیا۔

۲۔ حامد کی تقریر نے جلسے میں بے سبب بوریت پیدا کر دی۔

۳۔ میں آپ کی داداگیری نکال دوں گا۔

۴۔ اس نے خواہ مخواہ پھڈا کھڑا کر دیا۔

۵۔ ایک روپے کا کھلا چاہیے۔

۶۔ اس جگہ محمود کے بازو میں حامد کی دوکان ہے۔

۷۔ کاغذ کے بیوپاری نے کہا کہ مال خلاص ہو گیا۔

۸۔ اس نے ایک بیان داغ دیا اور کہا سیاست میں سب چلتا ہے۔

ان جملوں میں بور، بوریت، داداگیری، پھڈا، کھلا، بازو، خلاص اور چلتا ہے، ایسے الفاظ ہیں جو آئے دن سنے اور بولے جاتے ہیں۔ اب محض اس بنا پر کہ یہ الفاظ اردو میں پہلے سے موجود نہ تھے یا فلاں اور فلاں طبقے میں استعمال نہیں ہوئے۔ کون ہے جو انھیں مردود قرار دے گا۔ ان الفاظ نے معاشرتی زندگی میں پوری طرح جڑ پکڑ لی ہے اور اب انھیں عام وخاص سبھی استعمال کر رہے ہیں۔ نئے الفاظ کے ساتھ ساتھ پرانے الفاظ بھی نئے معنوں کے ساتھ اردو میں جگہ پا رہے ہیں۔ چند جملے دیکھیے:

۱۔ جلد بازی کی ضرورت نہیں ہے۔ تسلی سے کام کرو۔

۲۔ آرام آرام سے چلو ورنہ ٹھوکر کھا کر گروگے۔

۳۔ میرا دوست آج کل فلاں جگہ کمشنر لگا ہوا ہے۔

۴۔ آپ نے بہت کم کھایا کچھ اور لیجیے۔

۵۔ محمود صاحب آپ کو ساتھ والے کمرے میں مل جائیں گے۔

ان جملوں میں تسلی، آرام، کمشنر لگا ہوا ہے، کوئی چیز اور لیجیے اور ساتھ والے کمرے میں، کے الفاظ و فقرات پر غور کرنے سے اندازہ ہو گا کہ وہ اپنے معنی کس طرح بدل رہے ہیں۔ اس طرح کے اور نہ جانے کتنے الفاظ و فقرات اور محاورات و اسالیب ہیں جو مقامی زندگی اور علاقائی زبانوں کے زیر اثر اردو کو نیا رنگ روپ دے رہے ہیں۔ یہی صورت علاقائی زبانوں کی ہے۔ اردو کی معرفت ان کا دامن وسیع تر اور ان کا سرمایہ وقیع سے وقیع تر بنتا جا رہا ہے۔

باہم اخذ و استفادے کا یہ نیا سلسلہ چونکہ آزادانہ ماحول میں شروع ہوا ہے اس لیے یقین ہے کہ کسی طبقے کی اجارہ داری اب زیادہ عرصے تک باقی نہ رہے گی۔ ضرورت اس کی ہے کہ علاقائی زبانیں اور اردو اپنے باہمی رشتوں کو سمجھیں اور اپنے اپنے منصب کو پہچانیں۔ ساری علاقائی زبانیں اپنی اپنی جگہ اہم ہیں اور ان سب کا اپنا اپنا حلقۂ اثر ہے لیکن ان کا یہ حلقۂ اثر اپنے اپنے علاقے تک محدود ہے۔ اس کے برعکس اردو ہر علاقے اور ہر خطے میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اس کا علمی اور ادبی سرمایہ بھی علاقائی زبانوں کے مقابلے میں زیادہ ہے۔ اس لیے اسے پاکستان میں قومی زبان کا درجہ دیا گیا ہے۔ ہندوستان میں بھی کم از کم دوسری سرکاری زبان کی حیثیت سے اردو کو یہی مقام ملنا چاہیے کہ یہی زبان عموماً زیادہ بولی اور سمجھی جاتی ہے۔

قومی زبان کسی خاص علاقے یا گروہ کی زبان نہیں پوری قوم اور پورے ملک کی زبان ہوتی ہے۔ اس لیے اس پر پشاور سے لے کر کراچی تک سب کا یکساں حق ہے۔ اردو کا تصادم کسی علاقائی زبان سے نہیں انگریزی زبان سے ہے۔ اس کا حق علاقائی زبانیں نہیں انگریزی غصب کر رہی ہے۔